

بخیرہ راہب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکتساب علم..... افسانہ یا حقیقت

احسان الرحمن غوری*

عبدالستار غوری**

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے متعلق کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ اُن کے اپنے تخیل کی پیداوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں اُن کے متعلق کہتے ہیں کہ:

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا

نَهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۱)

”اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے۔ آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے۔ لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ بے شک آپ راہِ راست کی رہنمائی کر رہے ہیں۔“

متعدد معاندین اسلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور اُن کی تعلیمات کے حوالے سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کا پیغام یہودیت اور مسیحیت سے ماخوذ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام دراصل ابراہیمی سلسلہ ادیان کی آخری، کامل اور محفوظ ترین شکل ہے۔ ان ابراہیمی یا سامی ادیان کے بنیادی عقائد مشترک ہیں یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔ البتہ عبادات و معاملات کی دیگر تفصیلات میں اسلام مسیحیت اور یہودیت کے مقابلے میں زیادہ کا ملتفصیلات رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم نے یہ بات بھی صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ بنی نوع انسان کے لیے اللہ نے ہدایت کا مستقل سامان کیے رکھا۔ اور ہر دور میں ہر قوم کے لیے ایک ہادی ضرور بھیجا۔

تمام الہامی مذاہب ایک ہی مقصد لے کر ظہور پذیر ہوئے: انسانیت کی ہدایت۔ پیغمبر اسلام نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ

اسلام ایک نیا اور نوکھاند مذہب ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو بھی بہت واضح انداز سے بیان کیا ہے:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ

مُبِينٌ (۲)

* اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

** ریسرچ فیلو، المورد، لاہور۔

”(اے نبی) آپ کہ دیجیے کہ میں کوئی بالکل انوکھا پیغمبر تو نہیں۔ نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے۔ اور میں تو صرف علی الاعلان آگاہ کر دینے والا ہوں۔“

اسلام اور دیگر سامی مذاہب (یہودیت اور مسیحیت) کی چند قدریں مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تینوں مذاہب کا ماخذ ایک ہی ہے۔ تاہم اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ماخذ بائبل روایات ہوں۔ بعض مستشرقین نے اس امکان کو رد کیا ہے کہ اسلام مذکورہ دونوں ادیان کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ پروفیسر ٹنگمری واٹ لکھتے ہیں:

The possibility of his having read the Bible or other Jewish or Christian books may be ruled out. (...); and it is unlikely that he had ever read any other books. (۳)

”اس بات کا امکان قابل رد ہے کہ انھوں (محمدؐ) نے بائبل یا دیگر یہودی یا مسیحی کتب کو پڑھا ہو (.....)۔ اور یہ غیر متوقع امر ہے کہ انھوں نے کبھی بھی کوئی کتاب پڑھی ہو۔“
مارشل نے بھی انہی خیالات کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"Muhammad's standard for prophecy was, in principle, the experience and action of the old Hebrew prophets. But he knew nothing of them directly. His own experience was evidently very personal." (۴)

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الہام کا معیار بنیادی طور پر قدیم یہودی انبیاء کے تجربات اور اعمال کے مماثل تھا۔ لیکن وہ ان سب سے ناواقف تھے۔ واضح طور پر یہ آپ کے اپنے ہی تجربات تھے۔“

اسلام ایک ضابطہ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے نازل کیا تاکہ اس کے اس کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کو رہتی دنیا تک کے لیے رہنمائی مہیا کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیان کی بنیادی تعلیمات اپنی اصلیت اور اپنے مقاصد کے لحاظ سے مشترک ہیں۔ ان تینوں الہامی مذاہب کا جوہری طور پر باہمی مختلف ہونا بظاہر محال لگتا ہے کیونکہ تینوں کا ماخذ خدو منبع ایک ہی ہے۔ بنیادی تعلیمات مشترک ہیں: خالق کائنات ایک ہی ہے؛ وہی ہر چیز کا پروردگار ہے؛ اس کا کوئی ہم سر و ساتھی نہیں ہے؛ حیات بعد الموت شدنی امر ہے؛ قتل، زنا، جھوٹ، چوری، ظلم وغیرہ گناہ کے کام ہیں اور ان کی سزا مقرر ہے؛ رحم دلی، سچائی، خیرات، مخلوقات کی خدمت اور سماجی بہبود وغیرہ نیکی کے کام ہیں؛ لاکھوں سال قبل تک بھی یہ اچھائی تصور کی جاتی تھی، آج

بھی یہی حقیقت ہیں اور سینکڑوں ہزاروں سال بعد میں بھی یہی راست اقدامات تصور ہوں گے۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی ایک پیغمبر کی تعلیمات دوسرے کسی پیغمبر سے مختلف ہوں، چاہے ان دونوں پیغمبروں کے درمیان ہزاروں سال کا بعد ہو۔ تاریخی واقعات کا بھی تقریباً یہی معاملہ ہے۔ تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے لکھے اور مدون کیے جانے کے عمل کے دوران میں کچھ الحاقی مواد بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک مستشرقین کو بھی کرنا چاہیے اور اپنی تحریروں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے، نہ کہ ایسی بے بنیاد باتیں لکھ کر اپنے قارئین کو گمراہ کیا جائے۔ اس ضمن میں قرآن کریم کا بیان ہے کہ:

﴿سَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ . وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَهْلِ مُوسَىٰ لَقَضَيْنَا بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الدِّينَ أَوْرَثُوا لِكِتَابٍ مِنْ بَعْدِهِمْ لَقَدْ لَعْنَةُ اللَّهِ لِقَوْمٍ كَانُوا كَافِرِينَ﴾ (۵)

پیغمبر اسلام امی نبی تھے۔ آپ کا کسی بھی مذہبی رہنما سے کوئی رابطہ تھا اور نہ ہی آپ کو کسی مذہبی عالم سے علم حاصل کرنے یا ان کی شاگردی اختیار کرنے کا موقع ملا۔ ایک روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک تجارتی قافلے میں اپنے سرپرست ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ روایات کے مطابق آپؐ کی عمر مبارک اُس وقت نو یا بارہ سال تھی۔ قافلے نے بصری کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ بحیرہ یا بحیرہ نامی راہب نے آپؐ کو پہچان لیا کہ آپؐ ہی مالک کائنات کے رسول ہیں۔ جب اُس راہب سے پوچھا گیا کہ اس نے کیسے جانا کہ یہ ہونے والے نبی ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہر درخت اور پتھر نے آپؐ کو سجدہ کیا اور یہ کسی پیغمبر ہی کے سامنے جھکتے ہیں۔ بحیرہ راہب ہی کی ہدایت کے مطابق حضرت ابوطالب نے آپؐ کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ہمراہ واپس مکہ بھیج دیا۔ متعدد مستشرقین نے اسے واقعے کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور اس بات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر اسلام نے نبوت کی بنیادی ہدایات اسی بحیرہ راہب سے اخذ کی ہیں۔

سیرت نبویؐ کی یہ روایت حدیث کے مختلف مجموعوں میں کئی اسناد کے ذریعے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے سب سے مضبوط سند امام ترمذیؒ نے بیان کی ہے۔ دیگر تمام اسناد درجہ صحت سے اتنی فروتر ہیں کہ کسی بھی محدث نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ امام ترمذیؒ کی بیان کردہ روایت میں سلسلہ روایت درج ذیل ہے:

امام ترمذیؒ روایت کرتے ہیں فضل بن سہل سے، وہ عبدالرحمن بن غزوان سے، وہ یونس بن اسحاق سے، وہ ابی بکر بن ابی موسیٰ سے، وہ اپنے والد ابو موسیٰ اشعریؒ سے، انھوں نے فرمایا کہ ابوطالب شام کے سفر کے لیے نکلے۔ (۶)

مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سیرۃ النبیؐ میں اس واقعے سے متعلق اپنے تجزیاتی مشاہدات پیش کیے ہیں۔ اُن کے مشاہدات کا

خلاصہ حسب ذیل ہے:

اگرچہ (اس سلسلہ روایت میں) ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان کو اسماء الرجال کے چند ناقدین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ تاہم بعض دوسرے علماء کرام نے ان کی ثقاہت پر الزامات لگائے ہیں۔ علامہ ذہبی اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

”عبدالرحمن منکر احادیث روایت کرتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ناقابل قبول روایت بحیرہ کے قصے سے متعلق ہے۔ ممالیک سے متعلق ایک موضوع حدیث بھی اسی سے مروی ہے۔ حاکم لکھتے ہیں: اس نے منکر روایت امام لیث سے نقل کی ہے۔ ابن حبان لکھتے ہیں: یہ غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس راوی (عبدالرحمن) نے یہ روایت یونس بن اسحاق سے نقل کی ہے۔ چند نقادوں نے یونس کو قابل اعتبار راوی گردانا ہے۔ تاہم عمومی طور پر یہ کمزور اور غیر معتبر راوی سمجھے جاتے ہیں۔ یحییٰ کہتے ہیں: یہ بہت لاپرواہ اور غیر محتاط راوی تھا۔ شعبہ نے اس پر غلط بیانی اور دھوکے کا الزام لگایا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس سے مروی روایات کو عموماً بے وقعت قرار دیا ہے۔

یونس بن اسحاق نے یہ روایت ابوبکر سے بیان کی۔ جو اسے اپنے والد ابوموسیٰ العشری سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کا قطعی ثبوت موجود نہیں ہے کہ ابوبکر نے کوئی حدیث اپنے والد ابوموسیٰ العشری سے سنی ہے۔ امام احمد بن حنبل نے ان کے سماع کو مکمل طور پر رد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سعد نے انھیں کمزور راوی قرار دیا ہے۔ لہذا یہ روایت منقطع قرار دی جائے گی۔“ (۷)

سیرۃ النبی میں مذکور روایات کے اس مختصر تذکرے کے بعد ذیل میں ان راویوں کی ثقاہت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں سب سے پہلے راوی صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ابن الاثیر ان کے متعلق بیان کرتے ہیں:

”علم الانساب اور سوانح نگاروں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ ابوموسیٰ مکہ آئے اور سعید بن العاص سے معاہدہ کیا اور اس کے بعد اپنے قبیلے کی جانب لوٹ گئے۔ (قریباً دس سے پندرہ سال بعد) آپ اپنے بھائیوں کے ہمراہ دوبارہ مکہ آئے۔ اتفاق سے عین اسی وقت خیبر کی فتح کے بعد حبشہ کے مہاجرین بھی واپس آرہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کشتی ہوا کے زور سے نیگروؤں کے علاقے میں پہنچ گئی، جہاں انھوں نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ تب وہ حبشہ سے مدینہ واپس جانے والے مہاجرین کے ساتھ ہو لیے۔“ (۸)

ابوموسیٰؓ ۳۲-۵۳ھ کے دوران میں کسی وقت فوت ہوئے۔ جبکہ ان کی عمر ۶۳ برس تھی۔ (۹)

حافظ شمس الدین الذہبی نے ان کے متعلق بہت تفصیلی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوموسیٰؓ ۴۲ھ میں فوت ہوئے۔ ابوالاحد الحاکم کے بقول وہ ۴۲ھ میں فوت ہوئے اور ۴۳ھ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ابونعیم، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن نمیر اور قعنب بن المریر بیان کرتے ہیں کہ آپ ۴۲ھ میں فوت ہوئے تھے۔ جہاں تک واقدی کا تعلق ہے، وہ کہتے ہیں: وہ (ابوموسیٰ اشعری) ۵۲ ویں سال میں فوت ہوئے؛ اور

المدائنی کے بقول آپ ۵۳ ویں سال میں المغیرہ کے بعد فوت ہوئے۔ اور میں نے طبقات القرظی میں ذکر کیا ہے کہ حقیقت یہی ہے کہ ابو موسیٰ ذی الحجہ ۴۴ھ میں فوت ہوئے۔“ (۱۰)

ایسی ہی معلومات ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ (۱۱) اور ابن سعد (۱۲) نے بھی ذکر کی ہیں۔ مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

- ۱۔ ابو موسیٰ اشعریؓ ۶۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔
- ب۔ وہ ۴۲ تا ۵۳ھ کے دوران کے سالوں میں فوت ہوئے۔ اور زیادہ غالب امکان یہی ہے، جیسا کہ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے، کہ آپ ۴۴ھ ہجری میں فوت ہوئے۔
- ج۔ اگر آپ نے ۴۲ھ میں وفات پائی تو گویا آپ کی پیدائش کے وقت حضرت محمد ﷺ کی عمر مبارک ۳۲ سال تھی یعنی بحیرہ راہب کے واقعہ کو گزرے ۲۰ سے ۲۳ سال ہو چکے تھے۔
- د۔ اگر آپ نے ۵۳ھ میں وفات پائی تو غالباً آپ پیدائش کے وقت حضرت محمدؐ کی عمر ۴۴ سال ہوگی۔ گویا بحیرہ راہب والے واقعے کے ۳۱ سے ۳۴ سال بعد۔
- ہ۔ کسی بھی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے جو ان کی پیدائش سے بھی ۲۰ تا ۳۴ سال قبل وقوع پذیر ہوا۔ اور آپ کی بلوغت سے بھی ۳۰ سے ۴۰ سال پہلے کا واقعہ جب آپ اس قابل ہو سکتے تھے کہ ایسے واقعے کو کسی حد تک سمجھ یا یاد رکھ سکتے تھے۔

یعنی شاہد نہ ہونے کے باوجود حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا یہ بیان قابل قبول ہے اگر انہوں نے یہ روایت کسی ایسے راوی سے سنی ہو جس نے براہ راست نبی اکرمؐ سے یہ واقعہ سنا ہو۔ ایسے کسی بیان کی غیر موجودگی میں سلسلہ رواۃ منقطع سمجھا جائے گا اور ایسی روایت کو مرسل روایت کہتے ہیں۔ اس سے روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ضعف کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی اس روایت کی سند میں چند ایسی کمزوریاں ہیں جو اسے بالکل ناقابل قبول بنا دیتی ہیں۔

ابو بکر اس روایت کو اپنے والد ابو موسیٰ اشعریؓ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ بات محل نظر ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے کبھی کوئی روایت سنی ہو۔ ابو بکر ۱۰۶ھ (۱۳) میں وفات پا گئے تھے جبکہ ان کے والد ابو موسیٰ اشعریؓ ۴۲ھ (۶۳ سال کی عمر) (۱۴) میں فوت ہوئے۔ امام شمس الدین الذہبی کا قول اور نقل کیا گیا ہے، جس کے مطابق حضرت ابو موسیٰ ۴۴ھ ہجری یا ما بعد فوت ہوئے۔ (۱۵) گویا ابو بکر اپنے والد کی وفات کے بعد ۶۴ سال یا اس سے زیادہ زندہ رہے۔ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت اپنے لڑکپن میں ہوں گے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس قسم کے کسی بھی امکان کو رد کیا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ وہ ایک کمزور اور ناقابل اعتبار راوی ہے۔ حافظ یوسف مزنیؒ کے بقول ان کا نام عمر و یا عامر تھا۔ مزید لکھتے ہیں:

”اس نے الاسود بن ہلال، برہ بن عازب، جابر بن سمرہ، عبداللہ بن عباس، علی بن ابی طالب اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ایک غلط فہمی ہے کہ اپنے والد ابو موسیٰ اشعریٰ سے روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔“ (۱۶)

ابوبکر سے یہ روایت یونس بن اخطق نے بیان کی ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یونس بن اخطق کمزور، غیر معتبر، غیر محتاط راوی ہے۔ ابو حاکم کا کہنا ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیث پڑھ کر وہ مجھے اور وہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ چند ائمہ حدیث انھیں قابل قبول سمجھتے ہیں تاہم جمہور ائمہ حدیث کے نزدیک یہ غیر معتبر راویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ مزنی نے ان کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ حافظ مزنی کی بیان کردہ چند گزارشات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

صالح بن احمد بن حنبل، علی بن المدائنی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ وہ یحییٰ (کی محفل میں بیٹھے) ان (کا وعظ) سن رہے تھے۔ جب یونس بن اخطق کا تذکرہ آیا تو انھوں نے کہا اس میں توجہ اور احتیاط پسندی کا فقدان تھا اور یہ اس کی قدرتی اور پیداہنی کمزوری تھی۔ سلم بن قتیبہ کے حوالے سے بئر کہتے ہیں کہ میں (سلم بن قتیبہ) کو فہ سے آیا۔ شعبہ نے مجھ سے پوچھا تم وہاں کس سے ملے۔ میں نے کہا فلاں فلاں سے، اور میں یونس بن اخطق سے بھی ملا۔ انھوں نے پوچھا اس نے کون سی (حدیث) بیان کی۔ میں نے بیان کی (جو ان سے سنی تھی)۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔ میں انھیں بتایا کہ اُس (یونس بن اخطق) نے کہا کہ بکر بن باعظ نے مجھے حدیث بیان کی۔ شعبہ نے کہا کیا اُس نے یہ نہیں کہا کہ عبداللہ بن مسعود نے مجھے وہ حدیث سنائی؛ (جو واضح طور پر ایک ناممکن امر ہے کیونکہ دونوں شخصیات کے درمیان لمبے عرصے کا فرق ہے۔ گویا شععی اسے وضاع حدیث گردانتے ہیں)۔ ابوبکر الاثرم کہتے ہیں: میں نے ابو عبداللہ کو کہتے سنا ہے۔ جب یونس بن ابی اخطق کا ذکر آیا تو انھوں نے اس کی اپنے باپ سے بیان کردہ روایات کو غیر معتبر روایات گردانا ہے۔ ابوطالب نے احمد بن حنبل کو بتایا کہ یونس بن اخطق اپنی بیان کردہ ایک حدیث میں بعض لوگوں کے کہنے کے بموجب اضافہ کر دیا۔ اس کا بیٹا اسرائیل بن ابی اخطق سے حدیث سنتا اور اسے نقل کرتا۔ لیکن جتنی روایات میں یونس بن اخطق اپنی طرف سے اضافہ کرتا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”میں نے اپنے والد سے یونس بن اخطق کی بابت دریافت کیا۔“ انھوں نے بتایا کہ اس کی روایات بے ترتیب اور بے ربط ہیں (...). اس کی علمی حیثیت ابھی غیر متعین ہے۔“ ابو حاکم فرماتے ہیں کہ: یہ صاف گوتو تھا لیکن اس کی بیان کردہ روایات مستند ہیں اور نہ کسی معاملے کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ امام نسائی انھیں قابل قبول مانتے ہیں۔ ان کے بقول اس کی روایات میں کوئی حرج نہیں۔

وہ ۱۵۹ھ یا ۱۵۲ھ یا ۱۵۸ھ میں فوت ہوا۔ پہلی تاریخ زیادہ راجح ہے۔ (۱۷)

دوسرے راوی عبدالرحمن بن غردان ہیں۔ زیادہ تر علماء اسماء الرجال نے انھیں بڑا مضبوط، معتبر اور قابل قبول راوی بیان کیا

ہے۔ تاہم ان کی شخصیت کسی بھی الزام سے بری نہیں ہے۔ امام مزنی ان کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ابن جبان نے ان کے متعلق بتایا ہے کہ یہ غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ ان کی الممالیک کے قصے کے متعلق بیان کردہ روایت جو انھوں نے لیث، مالک، زہری، حضرت عروہ اور حضرت عائشہ سے روایت کی ہیں وہ دل میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔ محمد ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ وہ ۲۰۷ھ میں انتقال فرما گئے تھے۔“ (۱۸)

اب صرف ایک راوی فضل بن سہل الاعرج کا معاملہ زیر بحث ہے۔ اگرچہ وہ ایک مشہور راوی تھے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں چند اعتراضات بھی وارد ہوئے ہیں۔ خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں:

”مجھے خبر دی ہے احمد بن سلیمان بن علی المقری، ابوسعید احمد بن محمد المالمینی، عبد اللہ بن عدی وہ کہتے ہیں ”میں نے ابدن سے سنا ہے کہ اس نے ابوداؤد البستانی کو یہ کہتے سنا کہ وہ فضل الاعرج سے (بعض روایات) نقل کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ میں نے پوچھا وہ کیوں؟ انھوں نے کہا کہ (یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ) کوئی اچھی حدیث بھی ان کے پاس محفوظ نہ ہو۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ انھوں نے احمد بن الحسین الصوفی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فضل بن سہل الاعرج لومڑی کی طرح چالاک اور دھوکے باز شخص تھا۔“ (۱۹)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اگر سند میں کوئی ایک راوی پر بھی طعن کی جائے یا سند منقطع ہو یا سب سے پہلا راوی اس واقعے کا حصہ یا یعنی شاہد نہ ہو تو پوری سند ہی مشکوک ہو جاتی ہے اور وہ روایت یا حدیث غیر معتبر ٹھہرتی ہے۔ مذکورہ صدر حدیث میں کسی ایک راوی کا تو ذکر ہی کیا زیادہ تر راوی کسی نہ کسی حوالے سے مجروح ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس روایت کی سند منقطع سمجھی جائے گی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ پہلا راوی اس پورے واقعے کا حصہ ہے اور نہ ہی یعنی شاہد ہے۔ یہ حیران کن امر ہے کہ سند میں موجود اتنے شبہات کے باوجود ایک علمی تجزیہ نگار اس روایت کو کہیں حوالے کے طور پر کیسے پیش کر سکتا ہے۔ اور ایک ایسے اہم واقعے کے متعلق یہ روایت ثبوت کے طور پر بیان کرنا جس کا تعلق نبی کی دینی تعلیمات کے بنیادی ماخذ سے ہے قابل تحسین بات نہیں۔

علم روایت کی رو سے مذکورہ سند کا تجزیہ کرنے کے بعد علم درایت کے حوالے سے اس کے مندرجات کا بغور مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس روایت کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قریش کے بعض رؤسا کے ہمراہ ابوطالب رسول کریم کو ساتھ لے کر شام کے سفر کو نکلے۔ خانقاہ کے پاس پہنچ کر انھوں نے پڑاؤ کیا۔ (اس خانقاہ کا) راہب ان کے پاس آیا حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی بھی ایسے کسی قافلے کی جانب آیا تھا اور نہ اس پر کبھی توجہ کی۔ جب قافلے والے اپنا سامان اتار رہے تھے تو وہ راہب ان کے پاس سے گزرتا ہوا نبی کریم کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا، ”یہ جہانوں کا سردار ہے، مالک کائنات کا پیغمبر ہے، اللہ انھیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا ئیں گے۔“ سرداران قریش نے پوچھا کہ اسے اس بات کی خبر کیسے ہوئی؟ اس نے

بتایا ”جب تم لوگ گھاٹی میں سے نمودار ہوئے تو تمام نباتات و جمادات ان کے سامنے جھک گئے۔ اور یہ نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتیں۔ میں نے ان کے کندھوں کے نیچے موجود سیب کی مانند مہر نبوت کی بدولت بھی انہیں پہچان لیا۔ تب وہ لوٹا اور قافلے والوں کے لیے کھانا تیار کروایا۔ جب وہ کھانا لے کر پہنچا تو آپ (یعنی مستقبل کے نبی) اونٹوں کے ریوڑ کے پاس تھے۔ راہب نے آپ کو بلایا۔ آپ آئے اور ایک بادل کا ٹکڑا کہ آپ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ جب آپ لوگوں کے پاس پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ پہلے ہی سایہ بردار جگہوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ آپ ایک جگہ بیٹھ گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔ راہب نے کہا دیکھو درخت کا سایہ ان کی جانب سرک آیا ہے۔ وہ (راہب) ابھی تک قافلے والوں کے ساتھ تھے اور بہت احترام کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ اس (نبی ﷺ) کو باز نطینی علاقے کی طرف نہ لے کر جائیں کیونکہ جیسے ہی رومیوں نے آپ کو دیکھا وہ آپ کو پہچان جائیں گے اور قتل کر دیں گے۔ تب اچانک سات باز نطینی افراد نمودار ہوئے۔ اس (راہب) نے انہیں خوش آمدید کہا اور ان سے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ انہوں نے کہا ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ اس مہینے میں وہ نبی (موجود اپنے گھر سے) باہر آئیں گے۔ چنانچہ لوگوں کو چاروں طرف بھیج دیا گیا ہے۔ اور ہمیں اس راستے کی طرف بھیجا گیا ہے۔ راہب نے کہا۔ کہ تمہارے پیچھے تمہارا کوئی سردار بھی آ رہا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ سب سے زیادہ معزز ہونے کی وجہ سے اس راستے کی جانب بھیجے گئے ہیں۔

راہب نے ان سے کہا کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جس ارادے کی تکمیل کا اللہ تعالیٰ نے پکا ارادہ کر لیا ہو اسے کوئی دوسرا مکمل ہونے سے باز رکھ سکتا ہے؟ ان کے منفی جواب کے بعد اس نے انہیں پر زور طریقے سے قائل کیا کہ وہ اس کی وفاداری کا وعدہ کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی سنجیدہ درخواست کے نتیجے میں لوگوں نے اسے بتایا کہ ابوطالب ان (نبی) کے سر پرست ہیں۔ اس (راہب) کے مسلسل اصرار پر ابوطالب نے آپ کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ہمراہ (ابو بکر نے آپ کو بلال کے ہمراہ بھیجا جو مناسب ترجمہ نہیں لگتا) واپس (مکہ) بھیجا دیا۔ راہب نے ان کو راستے کے لیے روغن اور روٹی کا ٹکڑا پیش کیا۔ (۲۰)

مذکورہ متن کا ناقدانہ جائزہ لینے سے اس میں موجود بعض خامیوں کا پتا چلتا ہے۔ چند مشاہدات درج ذیل ہیں۔

- 1- ابوطالب کبھی بھی خوشحال نہ ہوئے۔ وہ اس حد تک غریب اور مجبور تھے کہ خود اپنے بچوں کی کفالت کے قابل نہ رہے تھے۔ آپ کے چند قریبی رشتہ داروں نے جو آپ پر مہربان تھے۔ آپ کے چند بچوں کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ ایک امیر شخص ہی تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ تجارتی قافلوں کے ساتھ دوسرے ممالک میں جاسکتا ہے۔ جبکہ ابوطالب اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ روایت بظاہر بعید از قیاس

- 5- مستشرقین نے اس واقعے کو اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر لیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی پیش کردہ دینی تعلیمات دراصل مسیحی عقائد سے بذریعہ بجیرہ راہب سیکھیں اور اخذ کی ہے۔ اگر مستشرقین اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک حقیقت ہے نہ کہ فسانہ۔ مخلصانہ طور پر اس واقعہ کی تحقیق و جستجو کرتے تو اسلام کے بارے میں ان کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔ جبکہ ان کا موجودہ رویہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ خود اس راہب کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے۔
- 6- اگر یہ بات ہوتی کہ تمام درخت اور پتھر محمد ﷺ کے سامنے جھک گئے تو یہ بات صرف اسی سفر تک محدود نہ رہتی۔ سیکڑوں، ہزاروں لوگوں نے مکہ اور دیگر علاقوں میں اس چیز کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ لیکن حدیث کی کسی کتاب میں صحیح روایت نہیں ملتی کہ جس میں اس معجزے کا تذکرہ موجود ہو۔ لہذا یہ ایک بے حقیقت روایت ہے۔
- چنانچہ اس حقیقت کا باسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کے سامنے کسی بھی صورت میں جھکانا ممنوع ہے۔
- 7- جہاں تک مہر نبوت کا تعلق ہے، بائبل میں اس کے متعلق کوئی واضح تذکرہ نہیں ملتا۔ اگر یہ مہر واقعی بنی کے کندھے پر موجود ہوتی، جیسا کہ اس روایت کے مطابق راہب نے اس کی تصدیق کی، تو یقیناً قریش کے کسی صالح عالم یا رہنما کے لیے پیغمبر اسلام کے اس دعوے کی صداقت سے کنارہ کشی کا کوئی جواز باقی نہ رہ جاتا۔ نتیجتاً وہ انھیں اللہ کا رسول مان لیتے اور ان کے پیش کردہ دین کو سچا جانتے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی کمر کے اوپری حصے (کندھے کی ہڈی کے نیچے) پر ایک غدود نما گلی موجود تھی۔ تاہم آپ نے کبھی بھی اسے اپنی نبوت کے دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اگر اس کا آپ کی نبوت سے کچھ بھی تعلق ہوتا تو یقیناً آپ اس کے متعلق خصوصی رویہ اپناتے۔ آپ کی یہ لائق ظاہر کرتی ہے کہ یہ گلی کوئی غیر فطری چیز یا معجزہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہ دلیل بھی اس روایت کو بے وقعت قرار دیتی ہے۔
- 8- اگر یہ واقعہ کسی خوش فہم بے وقوف دوست یا چالاک دشمن اسلام راوی کی اختراع نہ ہو بلکہ ایک صحیح واقعہ ہو تو لازماً نبی کریم نے اسے اپنی نبوت کے لیے واضح علامت کے طور پر بیان کیا ہوتا۔ اور حضرت محمد ﷺ کے ہم عصر کافروں کے لیے ایسی واضح اور ٹھوس نشانی کو سرے سے مسترد کر دینا بہت ہی مشکل امر ہوتا۔
- 9- متذکرہ بالا مشاہدات کا اطلاق پیغمبر اسلام کے اوپر بادلوں کے سایہ کرنے والے معاملے پر بھی ہوتا ہے۔ یہی مشاہدات درخت کے ایک طرف جھکنے اور نبی پر اپنا سایہ ڈالنے والے معاملے پر بھی مکمل طور لاگو ہوتے ہیں۔
- 10- بجیرہ راہب قافلے والوں کو بڑے اصرار کے ساتھ منع کرتا ہے کہ اس لڑکے کو بازنطینی علاقے میں نہ لے جایا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ لڑکے کو دیکھتے ہی اس کی نشانیاں پہچان جائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آنے والے نبی کے ظہور کی علامات اتنی صراحت کے ساتھ بائبل میں درج ہیں کہ یہ علامتیں کسی صورت بھی رومی بزرگوں کی نظروں سے بچ نہ سکتی تھیں۔ کیا یہ فاضل مستشرقین راہب کے ان خیالات سے متفق ہیں۔ اور اگر یہ اس راہب

کی بات کو سچ مانتے ہیں تو کس حد تک وہ اس سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں؟ کیا یہ اہل علم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نبی اسلام کی بابت علامات بائبل میں اتنے سادہ اور واضح انداز سے مذکورہ ہیں کہ بائبل کا کوئی عالم اس نبی ﷺ کو اس کے اوائل عمر ہی میں صرف ایک نگاہ میں پورے یقین کے ساتھ پہچان جاتے۔ جیسا کہ راہب کا خیال ہے۔

11- جہاں تک اس روایت میں مذکورہ اُن سات بازنطینی اکابرین کا یہ کہنا کہ وہ نبی اس ماہ کے دوران میں اپنی جائے رہائش میں نہیں ہے اُن کی اس معلومات کا ماخذ کیا ہے؟ جہاں تک بائبل کا تعلق ہے اس میں ایسی کوئی پیشین گوئی مذکور نہیں۔ عجیب بات ہے کہ ان فاضل مشرقین نے ایسی موضوع روایت کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا محل قائم کر دیا ہے جس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کی روشنی میں اس روایت کا تنقیدی جائزہ لینے سے یہ کھوکھلا محل ایک ہی ضرب سے ڈھے جائے گا۔

12- اگر یہ واقعہ سچ ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کے منصب نبوت پہ فائز ہونے کے اعلان پر اکابرین قریش اور خصوصاً ابوطالب اسلام قبول کرنے سے باز نہ رہتے۔

13- اگر اس قصے میں واقعی کوئی سچائی ہوتی تو اسلامی تاریخ کی کتابیں اس راہب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بیانات سے بھری ہوتیں۔ لیکن اُس وقت کی اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

14- اس روایت کے آخری حصے میں درج ہے کہ اس راہب کے اصرار پر ابوطالب نے اس مستقبل کے نبی لڑکے کو ابوبکرؓ و بلالؓ کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔ یہ اس قصے کے مکمل جھوٹ ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ حضرت ابوبکرؓ عمر میں نبی کریمؐ سے دو یا تین سال چھوٹے تھے۔ اگر مستقبل کے اس پیغمبر کی عمر اُس وقت ۹ سال ہوتی تو ابوبکرؓ صرف چھ سال کے ہوتے۔ اور اگر اُن کی عمر مبارک ۱۲ سال ہوتی تو ابوبکر اُس وقت نو سال کے ہوتے۔ اس میں گھڑت کہانی کا مصنف یہ بات بھول گیا کہ ابوبکرؓ نبی کریمؐ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ جیسا کہ تاریخ میں مذکور ہے۔ ابن سعد روایت بیان کرتے ہیں:

”محمد بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے شعیب بن طلحہ سے سنا، جنہوں نے یہ بیان کیا کہ ابوبکر الصديقؓ کے ایک بیٹے سے جس نے کہا ”بلالؓ اور ابوبکرؓ ہم عمر تھے۔ محمد بن عمر کہتے ہیں۔ ”یہ بات صحیح ہے اور یہ ثابت ہے کہ ابوبکرؓ

۱۳ھ میں فوت ہوئے۔“ (۲۲)

فن اسماء الرجال کے مستند ترین امام حافظ ذہبیؒ نے حضرت ابوبکرؓ کی حیات مبارکہ کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

”الصديق ۱۳ھ میں ماہ جمادی الاخرہ کے آغاز سے آٹھ روز قبل فوت ہوئے۔ اور ان کی عمر ۶۳ سال تھی“ (۲۳)

مذکورہ صدر روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مستقبل کے نبی لڑکے کے ساتھ حفاظت کی غرض

سے واپس گھر بھجوانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کے علاوہ ابوطالب کے متعلق یہ کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا کہ آپ نے کسی تجارتی سرگرمی میں حصہ لیا ہو۔ پیشے کے اعتبار سے وہ عطار تھے۔ اُن کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ لنگڑا تے تھے۔ (۲۱)

2- اگر یہ بات سچ بھی ہو کہ بحیرہ اتنا بڑا عالم اور منصوبہ ساز ہے کہ اسی نے محمدؐ کی نبوت کا منصوبہ تیار کیا تو مسیحیت کے اس عظیم محسن کے متعلق بہت سا مواد مسیحی تاریخ میں موجود ہوگا۔ اس کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں کئی جلدیں لکھی گئی ہوں گی۔ جبکہ (حقیقت یہ ہے کہ) جیسا کچھ بھی اُس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے وہ سب کچھ اسلامی تاریخ کی ایک کمتر درجے کی روایت سے مستعار ہے۔

3- بحیرہ راہب نے مستقبل کے نبی ہی کو چنا اور سردارانِ قریش کی موجودگی میں کہا کہ یہ لڑکا تمام جہانوں کا رہبر اعظم تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول اور رحمتہ للعالمین بنے گا۔ یہ سردار اس بات کے گواہ ہوں گے اور انھوں نے اس غیر معمولی واقعے کا تذکرہ واپس آ کر ضرور کیا ہوگا۔ اور یہ واقعہ پورے شہر کا موضوع بحث بن گیا ہوگا۔ کچھ سالوں بعد جب وہ بیت اللہ میں صبح سویرے نمودار ہوئے اور حجر اسود کی تنصیب کا تنازعہ ان کے ہاتھوں حل ہونا تھا تو لوگوں کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول آپہنچا، تمام مخلوقات کا رہنما آ گیا، رحمتہ للعالمین نمودار ہوئے۔ ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کے فیصلے کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اُن میں سے کسی ایک نے بھی آپ کو اس لقب کے ساتھ نہیں پکارا بلکہ وہ بولے کہ امین آ رہا ہے۔ جب آپ نے اپنے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا باقاعدہ اعلان فرمایا تو ہر کوئی بھاگ بھاگ آیا۔ اور آپ سے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا۔ تاریخ میں اس امر کا تذکرہ ضرور ہوتا کہ آپ پر ایمان لانے والے اس چیز کا اعلان کرتے کہ ہم پہلے ہی سے جانتے تھے کہ یہ نبی ہیں اور پہلے ہی سے ان کی نبوت کے اعلان کے منتظر تھے۔

4- جب بحیرہ سے دریافت کیا گیا کہ اس نے کیسے جانا کہ یہ لڑکا ایک دن نبوت سے سرفراز ہوگا۔ تو اُس نے جواب دیا کہ میں نے تمام درختوں اور پتھروں کو ان کے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا۔ اگر درحقیقت ایسا ہوتا تو آپ کو جاننے والے مکہ اور دوسرے علاقوں کے رہنے والے لوگ اس چیز سے واقف ہوتے۔ یہ ایک غیر معمولی، مافوق الفطرت عام طور پر نظر نہ آنے والا منظر ہے۔ اور عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس قافلے کے مسافر جو آپ کے ساتھ سینکڑوں میل تک سفر کرتے رہے، اس اہم منظر کو محسوس کرنے میں ناکام رہے۔ اور صرف بحیرہ راہب ہی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا۔ ایسی بات ہوتی تو بائبل میں پیغمبر اسلام کا یہ معجزہ انہی علامات کے ساتھ ضرور مذکور ہوتا۔ لیکن بائبل میں نبیوں کے متعلق ایسی علامت کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس روایت کے مشکوک ہونے کے لیے یہ ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

15- جہاں تک حضرت بلالؓ کا تعلق ہے، وہ غالباً اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے ہونگے۔ ابن سعد کے بقول:

”بلالؓ دمشق میں ۲۰ھ میں فوت ہوئے اور نہیں باب الصغیر کے مقام پر دفنایا گیا۔ جب وہ ساٹھ سال سے بھی زیادہ

عمر کے تھے۔ اور یہ (بھی) کہا جاتا ہے کہ وہ ۷۱ھ میں فوت ہوئے۔“ (۲۴)

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”وہ ملک شام میں ۱۷ یا ۱۶ھ میں فوت ہوئے اور ۲۰ھ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ان کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ

تھی۔“ (۲۵)

شمس الدین ذہبیؒ نے بھی حضرت بلالؓ کے دمشق میں انتقال ہونے سے متعلق چند روایات بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”محمد بن ابراہیم تمیمی، ابن اسحاق، ابو عمر الضری اور یحییٰ بن کبیر وغیرہ سے مروی ہے کہ حضرت بلالؓ دمشق میں ۲۰ھ

میں فوت ہوئے۔“ (۲۶)

حافظ جمال الدین الرمزی نے بھی چند روایات نقل کی ہیں۔ وہ امام بخاریؒ حوالے سے لکھتے ہیں حضرت بلالؓ حضرت عمرؓ کے

دو خلاف میں شام میں فوت ہوئے۔ عمر بن عبداللہ ابن لبرقیؒ روایت کرتے ہیں کہ وہ ۲۰ھ میں فوت ہوئے۔ واقدی اور امر بن

علی کہتے ہیں کہ انھوں نے ۲۰ھ میں دمشق میں وفات پائی جب وہ ساٹھ سال سے زائد عمر کے تھے۔ (۲۷)

مذکورہ تمام حوالوں سے باآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ:

ا۔ نبی اکرمؐ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ تقریباً ۶۳ سال کی عمر گزر کر فوت ہوئے۔

ب۔ نبی کریمؐ ۱۱ھ میں فوت ہوئے۔

ج۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ۱۳ھ میں وفات پائی یعنی نبی کریمؐ کی وفات کے دو سال بعد۔

د۔ حضرت بلالؓ ۱۷ یا ۱۹ھ اور غالب امکان ہے کہ ۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

کم از کچھ یا سات سال اور غالباً نو سال بعد۔

ہ۔ جب پیغمبرؐ نو سال کے تھے۔ حضرت بلالؓ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا پھر وہ ایک یا تین سال کے تھے۔

و۔ جب پیغمبرؐ کی عمر بارہ سال تھی، تو حضرت بلالؓ یا تو پانچ تا سات سال کے ہونگے یا غالب امکان یہ ہے کہ

وہ صرف تین سال کے تھے۔

گویا حضرت بلالؓ کو نبی کریمؐ کی حفاظت کی غرض سے بصری سے واپس مکہ تک کے سفر میں آپ کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ یہ

حقائق اس روایت کی استنادی حیثیت کو بہت حد تک مشکوک بنا دیتی ہے۔ مذکورہ صدر دلائل کی روشنی میں ایک بالغ نظر قاری بخوبی

اندازہ لگا سکتا ہے کہ معاندین اسلام کے اس بیان کی کیا حیثیت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی دینی تعلیمات ایک مسیحی راہب سے

سیکھیں۔

اس روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ اپنی شرح سنن ترمذی میں لکھتے ہیں:

”اور ہمارے ائمہ نے اس (روایت) کو ہمہ گم گردانا ہے۔ کیونکہ اس وقت نبی کی عمر مبارک بارہ سال تھی اور ابو بکرؓ ان سے دو سال (اور تین ماہ) چھوٹے تھے۔ جبکہ بلالؓ اُس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ میزان الاعتدال میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس روایت کی غیر مقبولیت ظاہر کرنے والی چند وجوہات میں سے ایک وجہ ان کے اپنے الفاظ میں اور اس نے ان کے ساتھ ابو بکرؓ بلالؓ کو بھیجا جبکہ بلالؓ اُس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور ابو بکرؓ ابھی ایک لڑکے تھے۔ اور ذہبی نے ان الفاظ کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف (اور ناقابل اعتبار) قرار دیا ہے۔ اور ابو بکرؓ نے ان کے ساتھ بلالؓ کو بھیجا، جبکہ ابو بکرؓ نے ابھی تک بلالؓ کو خریدایا ہی نہ تھا۔ (لہذا انہیں اس وقت بلالؓ کسی کو حکم دینے کا کوئی حق نہ تھا) (۔۔۔) اور حافظ ابن القیم اپنی تصنیف زاد المعاد میں لکھتے ہیں: جب وہ بارہ سال کی عمر کو پہنچے ان کے چچا انھیں اپنے ساتھ شام لے گئے، اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ اُن کی عمر اُس وقت صرف نو سال تھی اور یہ واضح طور پر جھوٹی روایت ہے۔ کیونکہ بلالؓ ابھی اس دنیا میں آئے ہی نہ تھے۔ اور اگر وہ زندہ ہوتے بھی تو ابو بکرؓ کے ساتھ (ان کے غلام) نہ ہوتے۔“ (۲۸)

مذکورہ صدر روایت میں مذکور ہے کہ اس راہب کے مسلسل اصرار پر اس مبعوث ہونے والے نبی لڑکے کو ابو بکرؓ و بلالؓ کی زیر نگرانی واپس مکہ بھیج دیا گیا۔ کیونکہ اگر وہ باز نطنی علاقے میں لائے جاتے تو ان کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔ اُس علاقے کے مذہبی علما انھیں پہچان لیتے اور انھیں قتل کر دیتے۔ ابو بکرؓ و بلالؓ اُن کے سفر میں ان کا ساتھ دینے کو نہ بھیجے گئے تھے اور نہ ہی یہ کوئی تفریحی دورہ تھا۔ یہ محض بے وقوفی ہے اور بالکل ناقابل یقین کہ ابو طالب جو اس لڑکے کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ تھا محبوب رکھتے تھے۔ انھیں محض دو کم عمر لڑکوں کی سرپرستی میں دے دیں؛ ان میں سے ایک آپ سے تین سال چھوٹا اور دوسرے (یعنی حضرت بلالؓ) نے یا تو ابھی پیدا ہونا تھا۔ (اگر نبی کی عمر اُس وقت نو سال تھی)، یا وہ دو سال کے ایک دودھ پیتے بچے ہوتے۔ اس امر کی وضاحت بہت مشکل ہے کہ کیسے ان فاضل مستشرقین نے اس اختراع شدہ روایت کو اپنی تصانیف میں جگہ دی حالانکہ بجا طور پر وہ محقق علما مانے جاتے ہیں؛ اور اس میں کوئی شک کی بات بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے ہوشیار اور اعلیٰ قلم کی مدد سے اس من گھڑت روایت کی بنیاد پر پورا محل تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ اُن کی خواہشات کی سوچ تھی جس نے اُن کو علم کی دنیا میں ایسے کم تر مقام تک پہنچا دیا۔

16- تقریباً پچیس سال کی عمر میں جب آپ جوان ہو چکے تھے، آپ نے خدیجہؓ کے سامان تجارت کے ہمراہ شام کا سفر کیا۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ زمین اور اس کے باشندے ان کے اتنے دشمن ہیں اور یہ کہ آپ کو دیکھتے ہی واضح علامتوں

کی مدد سے وہ آپؐ کو پہچان جائیں گے، تو آپؐ کبھی بھی یہ سفر نہ کرتے۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی جانب سے سامان تجارت لے جانے کی تجویز آنے پر آپؐ نے جھک کا مظاہرہ نہ کیا، اور پورے ارادے کے ساتھ اسے قبول کیا۔ اور ان محققین کے لیے حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آپؐ پر کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا۔ آپؐ ایک کامیاب تجارتی سفر کے بعد بحفاظت واپس لوٹ آئے۔

17- اس روایت میں ایک اور حیرت انگیز بات درج ہے کہ کسی بھی موقع پر راہب معبوث ہونے والے نبی لڑکے سے براہ راست مخاطب نہیں ہے۔ اس پورے مکالمے میں راہب اس لڑکے کے لیے صیغہ غائب یا اسم اشارہ استعمال کرتا ہے۔ اس پوری روایت میں کسی بھی موقع پر محمدؐ کے لیے مخاطب کا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ راہب یہ بات سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس عمر کا اور ایسے غیر تعلیم یافتہ ماحول سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے بیان کو سمجھ سکنے کے قابل ہوگا۔

اس مقالے کے اختتام پر کچھ مستشرقین کی چند متوازن آرا کا مطالعہ فائدہ مند ہوگا۔ David اور John B. Noss

S. Noss اپنی قابل ستائش کتاب "Man's Region" میں لکھتے ہیں:

"(...) The venerable tradition that he learned about Judaism and Christianity during caravan trips to Syria, the first when he was twelve in the company of Abu Talib and the second when he was twenty-five and in the employ of Khadija, whom he subsequently married, must be set aside as untrustworthy." (۲۹)

”قابل تعظیم (سمجھے جانے والی یہ) روایت کہ آپؐ (نبی کریم ﷺ) نے یہودیت اور مسیحیت کے متعلق شام کے سفروں کے دوران میں سیکھا۔ پہلا وہ (سفر) جب آپؐ بارہ سال کے تھے اور ابوطالب کے ہمراہ تھے اور دوسرا جب آپؐ پچیس سال کے تھے اور خدیجہؓ کے ملازم کی حیثیت سے گئے اور جن سے آپؐ نے بعد میں شادی کر لی، یہ روایت ناقابل اعتبار ہونے کی وجہ سے رد کر دینی چاہیے۔“

ایک اور صحیح الفطرت مستشرق تھامس کارلاک بھی اس موقف کی تردید کرتے ہیں کہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے سوا کسی راہب یا عالم سے اکتساب علم و فیض کیا ہے۔ تھامس کارلاک کے اپنے الفاظ درج ذیل ہیں:

"I know not what to make of that Sergius [Bahira or Buhayra, whatsoever the pronunciation be, has also been called as Sergius], the Nestorian Monk whom Abu Thalib and he are said to have lodged with; or how much any monk could have taught one still so young. Probably

enough it is greatly exaggerated, this of Nestorian Monk. Mahomet was only fourteen [according to the tradition he was either only nine or, at the most, twelve]; had no language but his own: much in Syria must have been a strange unintelligible whirlpool to him. ” (۳۰)

مذکورہ واقعہ کی سند میں پائے جانے والے سقم سے قطع نظر کرتے ہوئے، درایتی معیارات کے ذریعے کیا جانے والا جائزہ اس بات کا واضح اشارہ دیتا ہے کہ اس واقعے کی روایت کسی راوی کی غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ امکان بھی موجود ہے کہ اسلام کے مآخذ کو کھوکھلا ثابت کرنے کے لیے کسی عاقبت نااندیش نے فرضی واقعہ اختراع کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ تاہم مذکورہ دلائل کی موجودگی کے باوجود راقم اس امکان کو رد نہیں کرتا کہ کسی بھی تحقیقی کاوش میں غلطی کا احتمال بہر حال موجود رہتا ہے۔ اسلام کا اصل حسن ہی دلیل کی حاکمیت کا اظہار ہے۔ اس رائے کے برعکس اگر کوئی مضبوط دلیل سامنے آتی ہے تو اسے بصد خوشی و احترام تسلیم کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حواشی وحوالہ جات

- ۱- الشوریٰ ۵۲:۴۲
- ۲- الاحقاف ۹:۴۶
- ۳- W. Montgomery Watt, Muhammad Prophet and Statesman, Oxford University Press, 1961, 40
- ۴- Marshall G. S. Hodgson, The Venture of Islam, The University of Chicago Press, Chicago & London, Vol 1, Book 1, 1974, 161
- ۵- الشوریٰ ۱۳:۴۲
- ۶- امام ترمذی، جامع، کتاب المناقب، باب ابتداء نبوت، حدیث، ۱۵۵۲
- ۷- شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۱۱۹/۱
- ۸- أسد الغابۃ، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ۲۴۵/۳
- ۹- ایضاً، ۲۴۶/۳
- ۱۰- سیر أعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۳۹۷/۲
- ۱۱- الاصابہ فی تیز الصحابہ، مکتبہ الریاض الحدیثہ، ۱۹۷۸ء، ۳۵۹/۲
- ۱۲- الطبقات الکبریٰ، دار بیروت، بیروت، ۱۹۵۷ء، ۱۰۵/۲-۱۱۵
- ۱۳- عسقلانی، تقریب التہذیب، دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۵ء، ۳۹۷
- ۱۴- ابن الاثیر، أسد الغابۃ، ۲۴۶
- ۱۵- ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ۳۸۲/۲
- ۱۶- مزنی، جمال الدین یوسف، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۳۳/۳۳
- ۱۷- مزنی، ۳۹۱/۳۲
- ۱۸- ایضاً، ۳۳۷/۱۷
- ۱۹- خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مکتبۃ السلفیہ، مدینہ منورہ، سن ۳۶۵/۱۲
- ۲۰- امام ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب ۳، حدیث ۳۶۲۹
- ۲۱- ابن قتیبہ، المعارف، ۲۵۲، بحوالہ حبیب الرحمن کاندھلوی، مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت، ۱۱۰
- ۲۲- الطبقات الکبریٰ، ۲۳۸/۱
- ۲۳- ذہبی، تاریخ الحفاظ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، سن ۵/۱
- ۲۴- أسد الغابۃ، ۲۰۹/۱
- ۲۵- تقریب التہذیب، ۴۸
- ۲۶- ذہبی، تاریخ الاسلام، دار الکتب العربیہ، بیروت، ۱۹۸۷ء، ۲۰۵
- ۲۷- تہذیب الکمال، ۲۹۰/۲
- ۲۸- مبارکپوری، عبدالرحمن، تحفۃ الاحوذی، ضیاء السنہ، فیصل آباد، سن ۲۹۶/۲
- ۲۹- John B. Noss/David S. Noss, Man's Religion, Macmillan Publishing Company, New York, 1984, 501.
- ۳۰- Thomas Carlyle, On Heroes Hero-Worship and the Heroic in History, London, Oxford University Press, 1065, 68.